کیا یہ قابل فہم ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے ہی ستر ہزار آدمیوں کا قتل کر دیا تھا؟

اللہ رب العزت نے قرآنِ مجید میں موسیٰ علیہ السلام کا ایک قول ہمیں بتایا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَـٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

''اور [واپسی پر] جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا تھا'' اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔
اس لئے اپنے پیدا کرنے والے سے اپنے آپ کو ملامت کرتے، پچھتاتے ہوئے (احساس شرمندگی کیساتھ) توبہ مانگو۔
یہ بات تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے'' پھر (یہ کرنے پر) اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔
بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے'' (سورۃ البقرۃ ۵۴)

اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کے عام رواج کی ایک جھلک یہ ہے:

[ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی۔ تفسیر مولانا صلاح الدین یوسف۔ قرآنِ کریم شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس۔ سعودی عرب]

''جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ'' اے میری قوم! بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ تعالی کے نزدیک اسی میں ہے، تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی، وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہے'' [(۲) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شرک پر متنبہ فرمایا تو پھر انہیں توبہ کا احساس ہوا، توبہ کا طریقہ قتل تجویز کیا گیا۔ فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ (اپنے کو آپس میں قتل کرو) کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: ایک یہ کہ سب کو دو صفوں میں کر دیا گیا اور انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ دوسری، یہ کہ ارتکاب شرک کرنے والوں کو کھڑا کر دیا گیا اور جو اس سے محفوظ رہے تھے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے قتل کیا۔ مقتولین کی تعداد ستر ہزار بیان کی گئی ہے (ابن کثیر، فتح القدیر)]

[ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی۔ تفسیر مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی۔ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن]

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ'' اے میری قوم! تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ، تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو، یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے، تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی، بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان''۔ [تفسیر۔ (۵) یہ قتل ان کیلئے کفارہ تھا۔ (۶) جب بنی اسرائیل نے توبہ کی اور کفارہ میں اپنی جانیں دے دیں تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں گوسالہ پرستی کی عذر خواہی کیلئے حاضر لائیں۔ حضرت ان میں سے ستر آدمی منتخب کر کے طور پر لے گئے وہاں وہ کہنے لگے اے موسیٰ! ہم آپ کا یقین نہ کریں گے جب تک اللہ کو اعلانیہ نہ دیکھ لیں] (خیال میں تضاد ہے۔ رسول کے کہنے پر ستر ہزار بہن بھائیوں کی ''قربانی'' کفارے کے طور پر دیتے ہیں اور اس کے فوراً بعد اسی رسول کی بات نہیں مانتے؟)

تراجم اور تفاسیر کی اس جھلک میں اعتراف موجود ہے کہ یہ تحقیق کا نتیجہ نہیں بلکہ اپنے سے پہلوں کے تخیل کو محض دہرایا گیا ہے۔
عجیب بات ہے کہ بیتے زمانے کے بعض مفسرین بنی اسرائیل کے متعلق یہ حسن ظن بھی رکھتے تھے کہ یہ قوم اس قدر مطیع اور فرمانبردار تھی کہ اپنے رسول کے کہنے پر اپنے ہی لوگوں میں سے ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ انہوں نے فَاقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ کا ترجمہ ''آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو'' کرتے ہوئے تفسیر اور مفہوم میں کچھ یوں لکھ دیا تھا کہ '' موسیٰ علیہ السلام نے ان افراد کو جنہوں نے بچھڑے نما ڈھانچے کے گرد معتکف ہونے والی حرکت نہیں کی تھی ایسے لوگوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی اور اس حکم کی اطاعت میں بنی اسرائیل کے ''پارساؤں'' نے اپنے ستر ہزار افراد (مرد و زن) کو قتل کر دیا' اور قاتلوں اور مقتولوں کے متعلق یہ خیال، فیصلہ بھی لکھ دیا'' جنہوں نے قتل کیا وہ ''صالحین'' قرار پائے اور جنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی وہ مقتول ہو کر ''شہادت'' کے درجے پر فائز کر دیئے گئے''۔

مقام حیرت ہے اور شاید حدوں سے بڑھی ہوئی ''عقیدت'' اسی کو کہتے ہیں کہ بیتے زمانے کے بعض لوگوں کے ایک ایسے خیال کو تسلسل سے دہرایا گیا جسے مسترد کرنے کیلئے کسی خارجی دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔ ان کی یہ خیال آرائی یوں ظاہر کرتی ہے کہ جیسے زندگی کے ایک دور میں بنی اسرائیل فرمانبرداری کے کمال کی حدوں کو چھونے والی قوم تھی۔ لیکن اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں دوٹوک انداز میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل (یہودی) من حیث القوم کبھی بھی فرمانبردار نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی نفسیات یہ بتائی ہے کہ زمان کے ہر دور میں اس خواہش کے غلام ہیں کہ کائنات اور فطرت ان کی خواہشوں اور آرزوؤں کے مطابق چلے اور ہر چیز ویسے پیش آئے جیسے وہ چاہتے ہیں۔ ارشاد فرمایا: ''اور جب بھی (اے بنی اسرائیل) تمہارے پاس رسول آیا جو کوئی ایسی بات، پیغام لایا جو تمہارے دلوں کو نہ بھاتا تھا تو تم (نے استکبار کیا) اکڑ گئے۔ پھر تم نے ان میں سے کسی کو جھٹلا دیا اور کسی کو پریشان، زچ (قتل) کیا''۔ (حوالہ البقرۃ۔۸۷)

كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُولُۢ بِمَا لَا تَهْوَىٰٓ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُواْ وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝

(یہ حقیقت ہے کہ حیات کے ہر دور میں) جب بھی ان کے پاس رسول آیا جو کوئی ایسی بات، پیغام لایا جسے ان کے دل نہ چاہتے تھے تو انہوں نے (رسولوں میں سے) کسی کو جھٹلا دیا اور کسی کو پریشان، زچ (قتل) کیا''۔ (حوالہ المائدہ۔۷۰)۔

ایسی قوم کے بارے میں یہ کہنا کیا عجیب بات نہیں کہ انہوں نے اپنے ایک رسول کے کہنے پر ستر ہزار کی تعداد میں اپنے ہی بہن بھائی اور رشتے دار قتل کر دیئے تھے؟ کیا اس تخیلاتی بات کو تسلیم کرنے کی عقل و فہم اجازت دیتے ہیں؟
سوال یہ ہے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر ایک ایسی قوم اپنے ہی بھائی بہنوں اور رشتے داروں کو ستر ہزار کی تعداد میں قتل کر سکتی ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر ایک گائے کو ذبح (قتل) کرنے کیلئے بھی حجتیں کرتے تھے؟

إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُواْ بَقَرَةً

''اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے''

قَالُوٓاْ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا

بنی اسرائیل نے انہیں جواب دیا'' کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں '' (حوالہ البقرۃ۔۶۷)

آپ سوال کا جواب کیا دیتے ہیں؟ قرآنِ مجید کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو قتل (ذبح) کرنا تو دور کی بات بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر ایک گائے کو ذبح (قتل) کرنے کے حکم کی تعمیل سے بچنے کیلئے حجتیں کرتے اور بہانے تراشتے ہیں۔ اور آخر ایک گائے ذبح کرتے بھی ہیں تو بجھے دل کے ساتھ

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُواْ يَفْعَلُونَ''

''پھر انہوں نے اسے ذبح کیا۔ اور وہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے'' (حوالہ البقرۃ ۶۷۔۷۱)

سورۃ البقرۃ کی آیت ۵۴ میں ارشاد فرمایا:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَـٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ فَتُوبُوٓاْ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَٱقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

اور [واپسی پر] جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا تھا'' اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔
اس لئے اپنے پیدا کرنے والے سے اپنے آپ کو ملامت کرتے، پچھتاتے ہوئے (احساس شرمندگی کیساتھ) توبہ مانگو۔
یہ بات تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے'' پھر (یہ کرنے پر) اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔
بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے''

آیت میں ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم' کا ترجمہ مفسرین نے 'اپنے آپ پر ظلم' کیا تو سوال یہ ہے کہ جب خطاب قوم سے ہے نہ کہ چند سرداروں سے اور کہا گیا کہ 'تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے' تو اس صورت میں 'فَٱقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ' سے یہ مراد لینا کیسے درست تصور کیا جا سکتا ہے کہ ''دوسروں کو قتل کرو' جب اس کے لغوی معنی 'اپنے آپ کو قتل کرو' ہیں فَٱقْتُلُوٓاْ کا مادہ ''ق ت ل''

ہے جس کے معنی کسی کو مار ڈالنا، جان نکال دینا ہیں۔ جناب راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ذلیل و حقیر کرنے اور جھکا دینے کے بھی آئے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور مار ڈالنے کے ہیں۔ فَاقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ میں اگر ''قتل'' کے معنی جان سے مار ڈالنا تصور کئے جائیں تو ''اپنے آپ کو قتل کرو'' کا مفہوم خودکشی کرنا بن جائیں گے۔ اور اگر جناب راغب اور ابن فارس کی بات مان لی جائے تو اس کے معنی اور مفہوم ندامت، شرمندگی، اپنے آپ کو ملامت کرنا، پچھتانا ہوں گے۔ ''اپنے آپ کو ذلیل کرنا'' کا مفہوم ملامت، شرمندگی اور پچھتاوا ہی ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۲۹ میں ایمان والوں کو نصیحت کی گئی کہ ''ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ'' اور اس کے بعد فرمایا وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ۔ اگر رواج پر چلیں تو اس کے معنی یہ کرنے پڑتے ہیں ''اور اپنے آپ کو قتل مت کرو''۔ معاشرے میں دوسروں کا مال کھانے والا اپنے آپ کو قتل نہیں کرتا بلکہ معاشرے کی نگاہوں میں ذلیل وخوار اور بدنام ہوتا ہے اور اپنی ہی شخصیت کو مسخ کرتا ہے۔

سورۃ توبہ کی آیت ۳۰ میں قَـٰتَلَهُمُ ٱللَّهُ ۚ کے معنی یہ بیان کئے جاتے ہیں کہ ''اللہ انہیں ذلیل وخوار کرے، اللہ انہیں تباہ و برباد کرے''۔ سورۃ الذاریات کی آیت ۱۰ قُتِلَ ٱلْخَرَّٰصُونَ ﴿۱۰﴾ کے معنی بھی یہی لئے جاتے ہیں۔ ان مثالوں اور لفظ 'قتل' کے ذلیل وخوار کے حوالے سے آئمہ لغت کے بیان کردہ وسیع معنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فَاقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ میں ''قتل'' کا صحیح اور مناسب ترجمہ اور مفہوم اپنے آپ کو یا دوسروں کو جان سے مارنے کی بجائے ''نادم اور پشیمان ہونا اور اپنے آپ کو ملامت کرنا ہے''۔

جب ہم کسی کی غلط حرکت پر اسے کہتے ہیں ''ڈوب مرو'' تو مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اسے پانی میں ڈوبنے کا کہا ہے۔ اگر ان الفاظ یا محاورے کے معنی کسی دوسرے شخص کو سمجھ نہ آسکیں تو ان کے معنی معلوم کرنے کا انتہائی معتبر طریقہ یہ ہے کہ اس شخص کے جوابی عمل کو دیکھ لیا جائے جسے 'ڈوب مرو' کہا گیا۔ ضروری نہیں کہ اشخاص کے درمیان گفتگو اور مکالموں کے حقیقی معانی اور مفہوم استعمال کئے گئے الفاظ کے لغوی معنوں سے اخذ کئے جائیں بلکہ ان لوگوں میں رائج محاوروں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے تاکہ کہی گئی بات کی غایت اور روح کو سمجھا جا سکے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے ایک بات کہی ہے جس کے حقیقت کے زیادہ قریب اور مناسب معنی کیا وہی نہیں ہوں گے جو قوم کے قول اور عمل سے ظاہر ہوں؟ قوم کا ردِ عمل یہ بتایا گیا ہے:

وَلَمَّا سُقِطَ فِىٓ أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا۟ أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا۟

''اور جب وہ (موسیٰ علیہ السلام کے بتانے پر) پچھتائے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ بھٹک گئے تھے

قَالُواْ لَئِن لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ

تو کہنے لگے ''اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔

موسیٰ علیہ السلام قوم سے ہمکلام ہیں اور رحمت کے پیکر اللہ کے رسول لوگوں کے قتل کا فرمان خود جاری نہیں کرتے اور رحیم و کریم اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو توبہ کی مہلت دیئے بغیر قتل کروا دینا پسند نہیں فرماتا اور قرآنِ مجید بھی اس بات کی شہادت نہیں دیتا کہ اللہ رب العزت نے ایسا کوئی حکم دیا تھا بلکہ چالیس راتوں کے دوران اللہ تعالیٰ نے انہیں صرف یہ بتایا تھا:

قَالَ فَإِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۢ بَعۡدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾

''اس نے کہا'' مگر ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے کیونکہ سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے'' (طٰہٰ۔۸۵)۔

اور سورۃ البقرۃ کی زیرِ مطالعہ آیت میں موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس گمراہی کو اپنے آپ پر ظلم کرنے سے تعبیر فرما رہے ہیں جس سے واضح ہے کہ قوم کا کوئی فرد یا قبیلہ اس گمراہی، ظلم سے نہیں بچا تھا۔ قرانِ مجید میں جب قوموں اور قبیلوں کی گمراہی، ظلم، کفر وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان میں سے ایسے لوگوں کا تذکرہ بھی ساتھ ہی ملتا ہے جنہوں نے ان حرکات سے اجتناب برتا ہوتا ہے چاہے ان کی تعداد قلیل کیوں نہ ہو۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سیدنا ھارون علیہ السلام کا شمار قوم میں نہیں ہوتا، انہوں نے بھی ان سے کہا تھا ''اے میری قوم! تمہیں آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے۔ میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو'' (سورۃ طٰہٰ۔۹۱)۔ قرآنِ مجید کے اس اندازِ بیان کو مدِنظر رکھتے ہوئے قابلِ غور سوال ہے کہ کیا یہ گمان کرنے کے لئے کوئی ٹھوس دلیل، جواز اور شہادت موجود تھی کہ قوم کے چند 'پارساؤں' کو موسیٰ علیہ السلام نے دوسروں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا؟

بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آیا یہ واقعہ انسان کیلیئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں بنی اسرائیل کو آلِ فرعون سے نجات پانے کے بعد پیش آنے والے مختلف واقعات میں سب سے پہلے اسے بیان کیا گیا حالانکہ ان میں سے چند اس واقعہ سے قبل پیش آچکے تھے جیسے سمندر سے بحفاظت پار ہونے کے بعد بتوں کے پاس معتکف رہنے والے لوگوں کے علاقہ میں سے گزرتے ہوئے انہوں نے ان جیسا ''اِلٰہ'' لا دینے کی جاہلانہ خواہش کا اظہار کیا تھا۔ واقعہ یوں بیان ہوا

وَإِذۡ وَٰعَدۡنَا مُوسَىٰٓ أَرۡبَعِينَ لَيۡلَةً ثُمَّ ٱتَّخَذۡتُمُ ٱلۡعِجۡلَ مِنۢ بَعۡدِهِۦ وَأَنتُمۡ ظَٰلِمُونَ ﴿٥١﴾

(اے بنی اسرائیل) ''اور جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا تو تم ان کے جانے کے بعد بچھڑے (نما ڈھانچے) کے گرد (ھارون علیہ السلام کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود) معتکف ہو گئے۔ اور یہ تم نے ظلم کیا'' (البقرۃ۔۵۱)۔

وَوَٰعَدۡنَا مُوسَىٰ ثَلَٰثِينَ لَيۡلَةٗ وَأَتۡمَمۡنَٰهَا بِعَشۡرٖ فَتَمَّ مِيقَٰتُ رَبِّهِۦٓ أَرۡبَعِينَ لَيۡلَةٗۚ

''اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا اور انہیں اور دس سے پورا کیا،

یوں اس کے رب کی چالیس راتوں کا مقررہ وقت پورا ہوا''۔(حوالہ سورۃ الاعراف۔۱۴۲)

موسیٰ علیہ السلام مقررہ وقت (دن، تاریخ) سے شاید دس راتیں قبل پہنچ گئے تھے۔

وَمَآ أَعۡجَلَكَ عَن قَوۡمِكَ يَٰمُوسَىٰ ﴿٨٣﴾

''اور آپ کس وجہ سے اپنی قوم سے (یہاں) جلدی آ گئے ہیں اے موسیٰ (علیہ السلام)؟'' (طہٰ۔۸۳)

اس واقعہ کو انتہائی گہری نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی اہمیت اس نکتے سے بھی عیاں ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ ظلم اس حقیقت کے باوجود سرزد ہو گیا تھا کہ اس سے قبل اللہ کی واضح نشانیوں کو دیکھ بھی چکے تھے

وَلَقَدۡ جَآءَكُم مُّوسَىٰ بِٱلۡبَيِّنَٰتِ ثُمَّ ٱتَّخَذۡتُمُ ٱلۡعِجۡلَ مِنۢ بَعۡدِهِۦ وَأَنتُمۡ ظَٰلِمُونَ ﴿٩٢﴾

''اور موسیٰ (علیہ السلام) تمہارے پاس واضح نشانیاں لائے تھے۔ بعد ازاں تم نے ان کے جانے کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا۔

اور تم ظالم تھے'' (سورۃ البقرۃ۔۹۲)

یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملنے سے قبل اور ان کی عدم موجودگی میں اور بنی اسرائیل کو کھلی نشانیاں دکھانے کے بعد پیش آیا تھا۔

ٱلۡبَيِّنَٰتِ کے معنی ہیں وہ دلیل، نشانی وغیرہ جس سے کوئی چیز آشکارہ اور واضح ہو جائے، کسی چیز کو ظاہر کر دینا، نمایاں کر دینا، نشانیاں قرآنِ مجید کی آیات کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کو جو نو (۹) نشانیاں دی گئی تھیں انہیں بھی سورۃ الاسراء کی آیت ۱۰۱ میں ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖ کہا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام نے وقت مقررہ سے قبل طے شدہ مقام پر جاتے ہوئے ھارون علیہ السلام سے جو کہا تھا اسے یوں بتایا

وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَٰرُونَ ٱخۡلُفۡنِي فِي قَوۡمِي وَأَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِيلَ ٱلۡمُفۡسِدِينَ

''اور موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے بھائی ھارون (علیہ السلام) سے کہا' میری قوم میں میری جگہ حکمرانی کر،

اور اصلاح کرنا اور مفسدوں کی راہ پر نہ چلنا''

موسیٰ علیہ السلام چلے گئے۔ ان چالیس راتوں کے دوران موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توریت) عطا کی گئی۔ ان کی عدم موجودگی میں یہ ہوا:

وَٱتَّخَذَ قَوۡمُ مُوسَىٰ مِنۢ بَعۡدِهِۦ مِنۡ حُلِيِّهِمۡ عِجۡلٗا جَسَدٗا لَّهُۥ خُوَارٌۚ

''اور موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے ان کے پیچھے اپنے زیوروں سے (بنے ہوئے) ایک بچھڑے نما ڈھانچے کو معبود بنا لیا

جس میں سے آواز نکلتی تھی'' (حوالہ الاعراف۔۱۴۸)

اور ادھر اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر تحریر کی ہوئی توریت عطا فرمائی اور انہیں اس تلخ حقیقت سے آگاہ کیا:

وَمَآ أَعۡجَلَكَ عَن قَوۡمِكَ يَٰمُوسَىٰ ﴿٨٣﴾

''اور آپ کس وجہ سے اپنی قوم سے (یہاں) جلدی آ گئے ہیں اے موسیٰ (علیہ السلام)؟''

قَالَ هُمۡ أُوْلَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِي وَعَجِلۡتُ إِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضَىٰ ﴿٨٤﴾

اس نے کہا'' وہ میری پیروی کر رہے ہیں۔ اور میرے رب! میں نے تیری طرف آنے میں جلدی کی تاکہ تو راضی ہو'' (طٰہ۔۸۳۔۸۴)

موسیٰ علیہ السلام نے بڑے اعتماد سے کہا کہ وہ قوم کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں کیونکہ وہ ان کی پیروی کرتے ہوئے راہ راست پر ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ قوم ان کے نقش قدم پر پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ اردو/انگریزی زبان میں اس قسم کا تاثر دینے والے تراجم صحیح نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام انہیں وہیں رہنے کیلئے چھوڑ کر آئے ہیں اور ھارون علیہ السلام کو کہہ کر آئے تھے ''میری قوم میں میری جگہ حکمرانی کر، اور اصلاح کرنا اور مفسدوں کی راہ پر نہ چلنا''۔ موسیٰ علیہ السلام کے اعتماد کو سخت دھچکا لگا جب یہ بتایا گیا

قَالَ فَإِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۢ بَعۡدِكَ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ (طٰہ۔۸۵)

''اس نے کہا'' مگر ہم نے اس سبب سے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے کیونکہ سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے''

اس اطلاع کو پانے کے بعد غصے اور تاسف سے بھرے ہوئے وہ واپس قوم میں آئے اور انہیں سرزنش کی۔ اس واقعہ کے متعلق بتایا: ''تب موسیٰ (علیہ السلام) غصے سے بھرے اور افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹے۔ انہوں نے کہا'' اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے عمدہ وعدہ نہیں کیا، پھر کیا وہ زمانہ تم پر بہت لمبا ہو گیا ہے، یا کیا تم چاہتے ہو کہ تم پر تمہارے رب کا غضب آن اترے کہ تم نے مجھ سے کئے ہوئے وعدے کے خلاف کیا ہے؟'' (حوالہ طٰہ۔۸۶)۔ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۰ کی ابتدا میں بتایا

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوۡمِهِۦ غَضۡبَٰنَ أَسِفٗا قَالَ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُونِي مِنۢ بَعۡدِيٓۖ

''اور جب موسیٰ (علیہ السلام) غصے سے بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹے

تو کہا'' میرے بعد میری جگہ تم نے کیا بری فرمانروائی کی!

أَعَجِلۡتُمۡ أَمۡرَ رَبِّكُمۡۖ

کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے جلدی کرنا چاہی؟''

انہوں نے وضاحت پیش کی

قَالُواْ مَآ أَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا وَلَٰكِنَّا حُمِّلۡنَآ أَوۡزَارٗا مِّن زِينَةِ ٱلۡقَوۡمِ فَقَذَفۡنَٰهَا فَكَذَٰلِكَ أَلۡقَى ٱلسَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾ فَأَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلٗا جَسَدٗا لَّهُۥ خُوَارٞ فَقَالُواْ هَٰذَآ إِلَٰهُكُمۡ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾

''انہوں نے کہا''ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے وعدے کے خلاف نہیں کیا

لیکن لوگوں کی زیب وزینت والا سامان ہمارے پاس تھا جسے ہم نے اس وجہ سے ڈال دیا کہ سامری نے ایسا ہی کرنے کیلئے کہا''۔

''پھر وہ (سامری) ان کے لئے بچھڑا ڈھال لایا جس کے ڈھانچے میں سے آواز نکلتی تھی۔

پھر انہوں نے ہم سے کہا کہ یہ تمہارا الٰہ ہے اور موسیٰ (علیہ السلام) کا الٰہ مگر وہ بھول گیا ہے''(طٰہٰ ۸۷۔۸۸)

موسیٰ علیہ السلام کے سامنے قوم کے وہ لوگ وضاحت پیش کررہے ہیں جن کے پاس دوسرے لوگوں کے زیورات تھے۔ انہوں نے سامری کے کہنے پر زیورات واپس کئے لیکن زیوارت کی واپسی کا مطالبہ ان کے مالکان ہی کی جانب سے تھا جنہوں نے سامری کو آگے کیا تھا۔ سامری ہی نے ان لوگوں کو اپنے زیورات واپس لینے کا کہا تھا کیونکہ زیورات واپس کرنے والوں نے کہا تھا فَأَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلٗا ''پھر سامری ان کیلئے (جن کے زیورات تھے) بچھڑا ڈھال لایا''۔ اس ڈھانچے کی ان کیلئے عجیب بات یہ تھی جَسَدٗا لَّهُۥ خُوَارٞ ''اس کے جسد میں سے آواز (صوت) نکلتی تھی''۔ موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے اس جواب سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں:

(۱) ایک گروہ جن کے پاس لوگوں کے زیورات تھے اپنی صفائی میں کہہ رہا ہے کہ انہوں نے وعدہ خلافی کی تو سہی مگر اپنے اختیار اور مرضی سے نہیں۔

(۲) ان سے سامری نے کہا کہ لوگوں کے زیورات دے دیں۔ اور ان زیورات کو ڈھال کر سامری نے ان لوگوں کے لئے (بات کرنے والوں کے لئے نہیں) ایک بچھڑے کا مجسمہ بنا دیا۔

(۳) اس بچھڑے کے مجسمہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں سے آواز (صوت، sound) آتی تھی۔

(۴) اس پر سامری اور بچھڑے میں استعمال ہوئی دھات کے مالکان نے ان لوگوں (موسیٰ علیہ السلام سے متکلم) سے کہا کہ وہ بچھڑا ان کا الٰہ تھا اور موسیٰ کا الٰہ تھا مگر وہ بھول گیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے اس جواب سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ تمام قوم غلطی کی مرتکب ہوئی تھی اگر چہ ایک گروہ نے اپنی صفائی دیتے ہوئے الزام سامری کے گروہ پر لگا کر اپنی اس حرکت کے دو جواز بتائے کہ اول مجسمے میں سے آواز آتی تھی اور دوم یہ کہ سامری وغیرہ نے بچھڑے کو ان کا الہٰ قرار دیا تھا۔ ان کی اس وضاحت اور صفائی کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۸ میں اس دلیل سے رد کیا

أَلَمْ يَرَوْا۟ أَنَّهُۥ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا

''کیا وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ نہ تو وہ ان سے کلام (باتیں) کرتا ہے اور نہ ہی انہیں راہ دکھاتا ہے''

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

''کیا وہ یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا اور نہ ہی ان کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا تھا؟'' (سورۃ طٰہٰ۔۸۹)

موسیٰ علیہ السلام کو پیش کی گئی صفائی میں دوسری وجہ کہ انہوں نے تو دوسروں کی بات مانی تھی اس طرح رد کی گئی:

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَـٰرُونُ مِن قَبْلُ يَـٰقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِۦ ۖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ ٱلرَّحْمَـٰنُ فَٱتَّبِعُونِى وَأَطِيعُوٓا۟ أَمْرِى ﴿٩٠﴾ قَالُوا۟ لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَـٰكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ ﴿٩١﴾

''اور ھارون (علیہ السلام) نے بھی ان سے اس وقت کہا تھا'' اے لوگو! تمہیں اس کے سبب آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے اور بیشک تمہارا رب تو رحمٰن ہے۔ میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو''۔ لیکن اس کے باوجود (ھارون علیہ السلام کو) جواب دیا تھا کہ 'ہم اس (بچھڑے) کے عاکف بنے رہنے سے ہرگز نہیں ہٹیں گے جب تک موسیٰ (علیہ السلام) واپس نہیں لوٹ آتے' (سورۃ طٰہٰ ۹۰،۹۱)

موسیٰ علیہ السلام کو ایک گروہ کی طرف سے دیئے گئے جواب کو جس دلیل سے رد کیا گیا ہے اس کا اہم نکتہ یہ ہے کہ بچھڑے میں سے آواز (بے معنی صوت) نکلنے میں اتنی بڑی کیا بات تھی جسے سمجھنے کے لئے ''فلسفی'' ہونا ضروری ہو۔ کیا اتنی بھی عقل **commom sense** استعمال نہیں کر سکتے تھے کہ دیکھتے کہ وہ کسی سوال کا نہ تو جواب دیتا تھا، نہ لوگوں سے کلام کرتا تھا اور نہ کسی نفع یا نقصان کا موجب ہو سکتا تھا (جب کہ خود طرح طرح کی آوازیں نکالنے پر قادر تھے، سوال و جواب بھی کر سکتے تھے، کچھ نفع و نقصان بھی دوسروں کو پہنچا سکتے تھے) اور رہی یہ بات کہ اگر تذبذب کا شکار ہو گئے تھے اور خود فیصلہ کرنے کی قوت سے عاری تھے جس کیلئے موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے منتظر تھے تو ھارون علیہ السلام اور سامری دونوں میں سے کسی ایک کی بھی بات انہیں نہیں ماننی چاہئے تھی۔

اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا تھا کہ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِىُّ ''اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے''۔ اور

موسیٰ علیہ السلام نے سامنے کی ان سیدھی سادی باتوں کے پیشِ نظر قوم کو خود گمراہ ہونے کے جرم سے بری الذمہ قرار نہیں دیا اور قوم کو یہ فیصلہ سنایا

يَـٰقَوۡمِ إِنَّكُمۡ ظَلَمۡتُمۡ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلۡعِجۡلَ

''اے میری قوم تم نے بچھڑے کے گرد معتکف ہو کر اپنے آپ پر ظلم کیا ہے'' (حوالہ البقرۃ ۔۵۴)۔

موسیٰ علیہ السلام کی ان دلیلوں اور فرمان سے قوم کو غلطی کا احساس ہو گیا اور مان لیا کہ قصور ان کا ہے کہ وہ گمراہ ہو گئے تھے تب انہوں نے ندامت اور پشیمانی سے دعا کی کہ اگر اللہ نے رحم اور بخشش نہ کی تو وہ خسارہ پانے والوں میں ہوں گے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيٓ أَيۡدِيهِمۡ وَرَأَوۡاْ أَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّواْ قَالُواْ لَئِن لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡخَٰسِرِينَ ﴿١٤٩﴾

''اور جب وہ (موسیٰ علیہ السلام کے بتانے پر) پچھتائے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ بھٹک گئے ہیں تو کہنے لگے

''اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔ (الاعراف ۔۱۴۹)

''سُـقِـطَ'' کے معنی کسی چیز کا نیچے گر جانا۔ صاحب تاج نے اس کے معنی شرمندہ اور متحیر ہونا لکھے ہیں۔ زجاج نے کہا کہ اس کے معنی اپنے کئے پر حسرت اور شرمندگی کے احساس کا پیدا ہونا ہیں۔ ابن فارس کے مطابق اس کے معنی ندامت سے ہاتھ ملنے کے ہیں۔ قوم نے جب احساس کر لیا کہ گمراہ ہو گئے تھے تو پچھتائے اور ندامت اور پشیمانی کے ساتھ بخشش کے طلبگار ہوئے۔ اہلِ علم غور فرمائیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے قوم سے مکالمے کے الفاظ فَٱقۡتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمۡ کا مفہوم قوم کے عمل سے اس قدر واضح ہونے کے باوجود ان الفاظ کا اپنے ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر دینا مفہوم لینا کیا محض تخیل اور گمان نہیں تھا؟

موسیٰ علیہ السلام قوم سے فارغ ہوئے تو وَأَلۡقَى ٱلۡأَلۡوَاحَ ''اور تختیاں نیچے رکھ دیں''۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو فارغ کیا تھا اس کیلئے وَأَخَذَ بِرَأۡسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُۥٓ إِلَيۡهِۚ ''اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگے'' (حوالہ الاعراف ۱۵۰) قَالَ يَـٰهَـٰرُونُ مَا مَنَعَكَ إِذۡ رَأَيۡتَهُمۡ ضَلُّوٓاْ ﴿٩٢﴾ أَلَّا تَتَّبِعَنِۖ أَفَعَصَيۡتَ أَمۡرِي ﴿٩٣﴾

''انہوں نے کہا'' ھارون! جب تو نے انہیں دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تجھے کس بات نے روکا کہ تو میری پیروی نہ کرے؟ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟'' (طٰہٰ ۔۹۲۔۹۳)

موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے ھارون علیہ السلام کو اپنی جگہ قوم کا فرمانروا قرار دیا تھا۔ اس لئے ھارون علیہ السلام سے وہ

وجہ پوچھ رہے ہیں جو قوم کو گمراہ ہوتے ہوئے دیکھ کر بھی انہیں اس سے بچانے کی راہ میں رکاوٹ بنی تھی۔ ھارون علیہ السلام نے غصے سے مغلوب بھائی کو جواب دیا

قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي

کہا''میرے ماں جائے! لوگوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور مجھے قتل کیا ہی چاہتے تھے۔

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

تو مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسا اور مجھے ظالم قوم کے ساتھ نہ ملا''۔ (حوالہ الاعراف۔۱۵۰)

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي

کہا''اے میری ماں جائے! میری داڑھی نہ پکڑ اور نہ میرا سر۔

إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ

مجھے اندیشہ تھا کہ تو مجھ سے یہ نہ کہہ دے کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی ہے

وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي ۝

اور میری بات کا انتظار نہیں کیا''۔ (طٰہٰ۔۹۴)

موسیٰ علیہ السلام کے غصے اور افسوس کے جذبات کی کیفیت کا اظہار اپنے بھائی کی داڑھی اور سر پکڑنے سے ہوتا ہے اور ھارون علیہ السلام نے ان کے غصے کو سرد کرنے کیلئے ''ماں جائے'' سے مخاطب کر کے وضاحت پیش کی۔ ھارون علیہ السلام نے وضاحت فرما دی کہ قتل ہو جانے کا خوف رکاوٹ نہیں بنا بلکہ سبب یہ تھا کہ انہیں خدشہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام انہیں اپنی واپسی تک صبر کرنے کی بجائے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈالنے کا ذمہ دار قرار نہ دے دیں۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن قوم کا جواب یہ تھا 'ہم اس بچھڑے کے عاکف بنے رہنے سے ہرگز نہیں ہٹیں گے جب تک موسیٰ (علیہ السلام) واپس نہیں لوٹ آتے''۔ ھارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کا انتظار فرمایا۔ ھارون علیہ السلام پر سلام ہو۔ ان سے آئیں ہم بھی اظہار شرمندگی کریں کہ ہم تو سرکی ٹوپی کے سبز یا کالے رنگ کیلئے ایک نیا فرقہ رگروہ بنا لیتے ہیں۔ تفرقہ جبھی ہو سکتا ہے جب کسی مقام اور وقت پر کم از کم دو گروہ ایسے ہوں جو ایک دوسرے کے (سخت مرنے مارنے کی حد تک) مخالف ہوں (اختلافِ رائے تفرقہ نہیں)۔ اہلِ علم غور فرمائیں کہ سیدنا ھارون علیہ السلام کے اس جواب سے بھی کیا یہ بات عیاں نہیں کہ تمام قوم گمراہ ہو گئی تھی؟

اللہ تعالیٰ سے، موسیٰ علیہ السلام نے بھائی کی وضاحت اور جواب سے مطمئن ہونے پر، دعا مانگی تھی

قَالَ رَبِّ ٱغۡفِرۡ لِى وَلِأَخِى وَأَدۡخِلۡنَا فِى رَحۡمَتِكَ‌ۖ وَأَنتَ أَرۡحَمُ ٱلرَّٲحِمِينَ ﴿١٥١﴾

''انہوں نے کہا'' میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر

کہ تو رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے''۔ جواب تھا

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ ٱلۡعِجۡلَ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمۡ وَذِلَّةٌ فِى ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا‌ۚ

''بیشک جن لوگوں نے بچھڑے کو الہٰ بنایا ان کو دنیاوی زندگی میں ان کے رب کا غضب اور ذلت پہنچے گی

وَكَذَٲلِكَ نَجۡزِى ٱلۡمُفۡتَرِينَ ۝

اور جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں'' (الاعراف۔۱۵۱۔۱۵۲)۔

وَٱلَّذِينَ عَمِلُواْ ٱلسَّيِّـَٔاتِ ثُمَّ تَابُواْ مِنۢ بَعۡدِهَا وَءَامَنُوٓاْ إِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعۡدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٥٣﴾

''مگر جن لوگوں نے برے کام کئے پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لائے

تو بیشک تیرا رب اس کے بعد بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے''۔ (الاعراف۔۱۵۳)

آیت کے الفاظ پر اہلِ علم وفکر توجہ فرمائیں کہ کیا ان سے کسی طرح بھی ہزاروں لوگوں کو قتل کر دینے کی سزا تجویز کرنے کا جواز میسر آ سکتا تھا اور ہمیں سورۃ البقرۃ کی زیر مطالعہ آیت ۵۴ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ نے قوم کی توبہ قبول فرمائی تھی اور اس سے قبل آیت ۵۲ میں بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلطی کو درگزر اور معاف کر دیا تھا۔ اہلِ فکر اس نکتہ پر بھی غور فرمائیں کہ توبہ قبول کر لینے اور غلطی درگزر کر دینے کے بعد کسی کو قتل کر دینے کی سزا دینے کا اصول اللہ کی کتاب اور رسولوں کی زندگی میں ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ اور کسی کو قتل کرنا اس کے جرم کی سزا تو کہلا سکتا ہے مقتول کی جانب سے ''کفارہ'' نہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں ھارون علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود سامری نے تمام بنی اسرائیل کو گمراہ کر دیا تھا۔ اگر قوم میں سے کچھ لوگوں نے اس گمراہی سے اجتناب کیا ہوتا یا کوئی قابلِ قبول وضاحت دی ہوتی تو اللہ سے ہم کلام ہونے والے جلیل القدر رسول نے اپنی دعا میں بھائی کے ساتھ انہیں بھی یاد رکھا ہوتا اور ان کیلئے بھی دعا مانگی ہوتی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا جس سے واضح ہے کہ پوری قوم گمراہ ہو گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ سے بنی اسرائیل نے ندامت اور پشیمانی سے معافی طلب کر لی تھی اور استثناء والے اصول کے تحت معاف کر دیئے گئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم اور بھائی سے سوال وجواب اور تحقیقات کرنے کے بعد واقعہ کے مرکزی کردار سامری سے پوچھا تھا:

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَـٰسَـٰمِرِىُّ ﴿٩٥﴾

''اے سامری! (اس حرکت کے بارے میں) پھر تیرا کیا معاملہ (مقصد) تھا؟''

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُواْ بِهِۦ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ ٱلرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِى نَفْسِى ﴿٩٦﴾

اس نے کہا ''میں نے وہ دیکھا جو دوسروں نے نہ دیکھا پھر میں نے رسول کے نقشِ پا سے مٹھی بھری اور اسے ڈال دیا اور میرے نفس نے اسی طرح مجھے ترغیب دی''۔ (سورۃ طٰہٰ۔۹۵۔۹۶)

سامری سے اس کا معاملہ، مقصد پوچھا گیا تھا لیکن اس نے بے سروپا مبہم ومہمل، بے معنی اور لغو جواب دیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُس جواب کے کوئی معنی ہوتے یا یہ مبنی بر دلیل ہوتا تو کیا موسیٰ علیہ السلام سامری کو سزا دینے سے قبل اس کی ''دلیل'' اور ''صفائی'' کو دلیل سے رد نہ فرماتے جیسے قوم کی وضاحتوں کے سلسلہ میں کیا گیا تھا؟ کیا کسی بھی ملزم کو سزا دینے سے قبل اس کی جانب سے صفائی میں پیش کئے گئے دلائل، وضاحت اور ثبوت کو رد کرنا ضروری نہیں ہوتا؟ اور کیا مجرم کی سزا کی شدت کا دارومدار جرم کے مقصد پر نہیں ہوتا؟ سامری کی بات کا جواب نہیں دیا گیا تھا اور اسے سزا سنا دی گئی تھی جس سے واضح ہے کہ اس کی بات بے سروپا اور لغو تھی جس کے کوئی معنی اور مفہوم نہیں تھا۔ اس کو دی گئی سزا میں غضب اور ذلت کے دونوں پہلو موجود تھے۔

قَالَ فَٱذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِى ٱلْحَيَوٰةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ

''کہا'' جا! اب تیرے لئے زندگی میں یہی ہے کہ تو کہتا پھرے گا ''مجھے مت چھونا (میرے قریب نہ آنا)

وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّن تُخْلَفَهُۥ

اور تیرے لئے وعدے کا ایک وقت ہے جس کے خلاف تو نہیں کر پائے گا''۔

وَٱنظُرْ إِلَىٰٓ إِلَـٰهِكَ ٱلَّذِى ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا

''اور دیکھ اپنے اس اِلٰہ کی طرف جس کے پاس تو ٹھہرا ہوا ہے''

اس مقام پہ نوٹ کرنے والی خاص بات یہ ہے کہ سامری اس وقت بھی بچھڑے کا عاکف تھا۔ وہ اپنے اِلٰہ پر سایہ فگن تھا۔ اس نے اپنی حرکت پر ندامت کا اظہار کیا اور نہ ہی بچھڑے کا قرب چھوڑا۔

لَّنُحَرِّقَنَّهُۥ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُۥ فِى ٱلْيَمِّ نَسْفًا ۝

''ہم اسے آگ میں جلا (پگھلا) کر منتشر کردیں گے اور بعد ازاں اسے سمندر کی لہروں میں دور دور بکھیر دیں گے'' (سورۃ طٰہٰ۔۹۷)۔

اس قصے کے مرکزی کردار کو اپنی غلطی پر ڈٹے رہنے کے باوجود قتل کی سزا کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وجہ؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہی تھا کہ ایسے لوگوں کو دنیاوی زندگی میں ذلت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو دنیاوی زندگی میں غضب اور ذلت کی سزا دی

إِنَّ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ ٱلۡعِجۡلَ سَيَنَالُهُمۡ غَضَبٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَذِلَّةٞ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَاۚ

''بیشک جن لوگوں نے بچھڑے کو الہٰ بنایا انہیں رب کا غضب اور ذلت دنیاوی زندگی میں پہنچے گی'' (حوالہ الاعراف۔۱۵۲)

اس واقعہ پر ''مرتد کی سزا قتل ہے'' والی ''دلیل'' بھی چسپاں نہیں ہوتی کیونکہ اللہ کے رسول ایک ہی جرم کے لئے مختلف ''مجرموں'' کو بیک وقت الگ الگ قسم کی سزا تجویز نہیں کرتے۔ یہ بعید از قیاس ہے کہ اللہ کا رسول ایک ''مرتد'' کو قتل کرنے کا حکم دے اور سب سے بڑے مجرم، مرتد اور باغی کو زندہ رہنے دے۔ قرآنِ مجید میں بے وقوفانہ طرزِ عمل سے لے کر شرک تک کو 'ظلم' قرار دیا گیا ہے۔ ''اپنے آپ پر ظلم'' تو ان متقین سے بھی سرزد ہو جاتا ہے جن کے لئے جنت بنائی گئی ہے جس پر وہ اللہ کو یاد کرتے اور اس سے استغفار کرتے ہیں۔ (حوالہ آلِ عمران۔۱۳۴۔۱۳۵)۔ اور اللہ تعالیٰ کا عام اعلان ہے

وَمَن يَعۡمَلۡ سُوٓءًا أَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهُۥ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ ٱللَّهَ يَجِدِ ٱللَّهَ غَفُورٗا رَّحِيمٗا ﴿١١٠﴾

''اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھے بعد ازاں اللہ سے استغفار کرے تو اللہ کو غفور و رحیم پائے گا''۔ (النساء۔۱۱۰)

سامری جادوگر نہیں ہے بلکہ انتہائی گھناؤنا اور خطرناک کردار ہے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ میں قابلِ غور اور اہمیت کا حامل نکتہ یہ ہے کہ ایک معمولی سا صوتی اثر پیدا کر کے سامری نے پوری قوم کو گمراہ کر دیا تھا۔ بنی اسرائیل نے سیدھی سادی حقیقتوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنی عقل اور **common sense** کو استعمال کئے بغیر سامری کی لغویات کو مان لیا۔ مغضوب قوم کے راستے پر چلنے سے بچنے کا بنیادی اہم نکتہ یہ ہے کہ کسی کی بات کو ماننے سے پہلے کم سے کم **common sense** کا استعمال کر لینا چاہئے۔ ہر دور کے سامری سے بچنے کا راز تدبر اور غور و فکر ہے جب کہ ''صوتی اثر'' انسان کو اپنے آپ سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔

''صوتی اثر'' کی حقیقت کیا ہے اور یہ کیوں خطرناک ہے؟ اللہ تعالیٰ سے ابلیس نے تھا کہ اگر اسے روزِ قیامت تک مہلت مل جائے تو وہ سوائے تھوڑے لوگوں کے بنی آدم (علیہ السلام) کو قابو میں کر لے گا۔

قَالَ أَرَءَيۡتَكَ هَٰذَا ٱلَّذِي كَرَّمۡتَ عَلَيَّ

''اس نے کہا' کیا تو نے غور کیا کہ یہ ہے وہ جسے تو نے میرے مقابل عزت دی ہے

لَئِنۡ أَخَّرۡتَنِ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡقِيَـٰمَةِ

اگر تو نے مجھے روز قیامت تک مہلت دی تو

لَأَحۡتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُۥٓ إِلَّا قَلِيلًا

اس کی اولاد میں سے تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر دوسروں کو میں اپنے قابو میں کرلوں گا'' (الاسراء-۶۲)۔

سچ تو یہ ہے کہ بنی آدم کو مکرم کئے جانے پر ابلیس نے اسے گمراہ کرنے کے متعلق توہین آمیز الفاظ کا چناؤ کر کے بھی اپنے سینے میں حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ کو دکھایا تھا۔ لفظ **لَأَحۡتَنِكَنَّ** کا مادہ ''ح ن ک'' ہے۔ جانور کے منہ میں ایک تو لگام دی جاتی ہے اور جب لگام نہ ہو تو ایک رسی کو اس کے نچلے جبڑے میں دے کر ٹھوڑی کے نیچے بل دیدیا جاتا ہے اور اس طرح اسے پکڑ کر لے چلتے ہیں۔ اس کے معنی کسی پر غالب آنا، قابو پانا، نکیل ڈالنا ہیں۔ ابلیس کو رجیم، دھتکارا ہوا قرار دے کر مہلت اور اجازت دی گئی

وَٱسۡتَفۡزِزۡ مَنِ ٱسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُم بِصَوۡتِكَ

''اور ان میں سے جن کو تو کر سکے اپنی آواز سے انہیں تھر کا (گڑ بڑا) دے'' (حوالہ الاسراء-۶۴)

ٱسۡتَفۡزِزۡ کا مادہ ''ف ز ز'' ہے اور اس کے معنی جگہ سے ہٹ جانا، الگ ہونا، ایک طرف ہٹنا، نکال دینا، بیقرار کرنا، خوف سے پریشان کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے کے ہیں۔ لہٰذا اس لفظ کے معنوں میں دل کا اضطراب بھی شامل ہے اور محسوس طور پر اپنی جگہ سے ہٹ جانے کے ہیں۔ ہلکا ہو کر اپنے مقام سے اکھڑ جانا دونوں میں شامل ہوتا ہے۔ یعنی کسی کو گڑ ابڑا دینا اور اس طرح اسے اس کے مقام سے اکھیڑ دینا۔ موسیقی (صوت) کی بعض دھنوں پر بعض لوگوں کے پاؤں تھر کنا اور جسم کے دوسرے اعضاء مضطرب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور نگاہوں کی خیانت سے لطف اندوز ہونے والے اس کو جسم کی شاعری قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ حکم یہ ہے **وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِأَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ** ''اور نہ اپنے پاؤں سے زمین پر ضرب لگا کر چلیں تاکہ کوئی مرد ان کی زینت کو جان نہ لے جو وہ چھپاتی ہیں''۔ (حوالہ سورۃ النور-۳۱)۔ زمین پر پاؤں مار کر چلنے سے عورت کی کون سی زینت چھلک کر دکھائی دینے سے بعض کے دل میں عجیب سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے، سب جانتے ہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ سامری نے صوت پیدا کر کے بنی اسرائیل کو گمراہ کر دیا تھا۔ ''اور ان میں سے جن کو تو کر سکے اپنی آواز سے انہیں تھر کا (گڑ بڑا) دے'' (حوالہ الاسراء-۶۴)۔ ابراہیم علیہ السلام سے آ تائے نامدار ﷺ کے زمان تک پہنچتے پہنچتے بنی اسماعیلؑ کے اکثر لوگوں کی نماز بھی سیٹیاں اور تالیاں (ابھی ہارمونیم اور طبلہ ایجاد نہیں ہوئے تھے) بجانا رہ گئی تھی۔

آج کے دور میں بھی اگر ہم اپنے اردگرد نگاہ دوڑائیں اور غور کریں تو معلوم ہو گا کہ سامری سے بھی زیادہ بھونڈے انداز میں نہ جانے کتنے لوگ اپنی عقل اور شد بد (common sense) کو استعمال نہ کرنے کے عادی اور کند ذہن لوگوں کی نفسیات اور کمزوری کو گمراہ کن طریقے سے استعمال کرتے ہوئے جنت میں پہنچنے کے ایسے آسان نسخے اور فارمولے سمجھا رہے ہیں جن کی نہ کوئی سند ہے اور نہ ہی کوئی معقول دلیل بلکہ معمولی غور کرنے پر بھی ہر کوئی انہیں لغویات قرار دے گا۔قرآنِ مجید نے ''سامری'' کو پہچاننے کا طریقہ ہمیں بتا دیا ہے۔ کوئی شخص لوگوں کو اپنے اردگرد مجتمع کرنے کیلئے حیران وششدر کر دینے والی ایسی بے مقصد حرکت کرے، شعبدہ بازی کرے، جو عقل وفہم کو سلب کر لے، ماند کر دے تو یہ محض سامریت ہے اور کچھ بھی نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے ایک مرتبہ اس شخص سے اُس کی اِس طرح کی حرکت ر''علم'' کا مقصد پوچھ لینا چاہیے۔

ہمیں یہ بھی سوچنا ہو گا کہ اس واقعہ میں جو نکتہ عیاں ہے کس قدر قابلِ غور اور اہمیت کا حامل ہے۔آلِ فرعون سے نجات دلانے کے بعد بنی اسرائیل کی جس بیوقوفی اور احمقانہ حرکت کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے نظر آنے والی سیدھی سادی حقیقتوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنی عقل اور common sense کو استعمال کئے بغیر سامری وغیرہ کی لغو باتوں کو مان لیا۔مغضوب قوم کے راستے پر چلنے سے بچنے کا بنیادی اہم نکتہ یہ ہے کہ کسی کی بات کو ماننے سے پہلے کم سے کم common sense کا استعمال کر لینا چاہیے۔ہمیں غور کرنا ہو گا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسی طرح ہم بلاتحقیق وتجسس محض بعض حضرات کے ذاتی خیال اور گمان یا من گھڑت اسرائیلی روایات کے زیرِ اثر کہی ہوئی بات پر یقین کر کے عرصہ دراز سے تصور کئے بیٹھے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر قوم کے لوگوں نے اپنے ستر ہزار آدمیوں کو قتل کیا تھا اور مقتول شہادت کے درجے پر فائز کر دیئے گئے تھے اور قتل کرنے والے (جنہوں نے روایت کے بقول جرم نہیں کیا تھا) صالحین قرار پائے تھے۔ پھر یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ کیسی عجیب وغریب تھی یہ 'سزا' کہ (مجرمین۔مرتد) مقتول ہو کر انعام یافتگان کی فہرست (انبیاء، صدیقین، شہیدین، صالحین) میں ہمیشہ زندہ رہنے والے مقام پر پہنچ گئے اور قتل کرنے والوں (جنہوں نے جرم نہیں کیا تھا) کے حصے میں کمتر پوزیشن آئی! واضح ہوا کہ اس خیال آرائی کا سچائی اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو قتل کرنے کا فرمان جاری کیا تھا اور بنی اسرائیل نے اطاعت رسول میں اپنے ستر ہزار آدمی قتل کر دیئے تھے۔

سامری نے سونے کے زیورات کو ڈھال کر ایک بچھڑے کا مجسمہ بنایا تھا۔سامری اور زیورات کے مالکان نے بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں سے کہا کہ هَٰذَآ إِلَٰهُكُمْ وَإِلَٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِىَ ''یہ تمہارا الٰہ ہے اور موسیٰ کا الٰہ ہے لیکن وہ بھول گیا ہے'' (حوالہ طٰہٰ۔۸۸)۔سامری کا یہ فعل نادانستہ نادانی کا نتیجہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا فریب تھا۔ھارون علیہ السلام چونکہ وہاں موجود تھے اس لئے بچھڑے کو ان کا ''اِلٰہ'' قرار نہیں دیا کہ وہ اس کی نفی کریں گے تو لوگ سامری کی بات ماننے میں تذبذب کا شکار ہو سکتے تھے۔

بچھڑے کو موسیٰ علیہ السلام کا اِلہٰ قرار دے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کیلیئے لوگوں کو یہ بھی کہا کہ ''وہ بھول گئے ہیں''۔ اور یوں لوگوں کے ذہن کو اپنی بات میں وزن دکھانے اور اس جانب راغب کرنے کیلیئے نکتہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے پر ان سے پوچھ سکتے ہو کہ وہ بھولے تھے کہ نہیں بھولے۔

سامری نے اس بچھڑے کو کوئی نام نہیں دیا تھا لیکن شعبدہ دکھایا تھا کہ اس میں سے آواز نکلتی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے لوگوں کو دور کرنے اور دوسروں کو اِلہٰ اور اس کا شریک منوانے کیلیئے ضروری ہے کہ مجسمے، شئے کو نام دے کر ہست کیا جائے یا کوئی دوسرا شعبدہ دکھایا یا کسی سے منسوب کیا جائے وگرنہ بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی اسے اہمیت اور تقدس دینے پر تیار نہیں ہوگا۔ زمان کے ہر دور میں فریب کرنے والے ''سیانوں، سامری'' نے لوگوں کو گمراہ اور اپنے دائرے، حلقے میں محض اس فریب سے قید کیا ہے۔ کسی کے چہرے اور ذہن کو پڑھ کر کچھ بتا دینا بھی محض شعبدے بازی ہے کہ اس سے دوسرا شخص مرعوب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان کے دامِ فریب میں پھنستے وہی ہیں جو دانستہ عقل وفہم، تدبر، تفکر سے کام نہیں لیتے اور مجاز، صنم، شخصیت پرستی کو ترجیح دیتے ہیں۔